قومیّت اور وطنیّت کی تحریک کا فروغ

اور

اس کا اسلامی حل

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

معاشرہ کی شیرازہ بندی انسان طبعاً اجتماعیت پسند ہے۔ وہ تنہا اور منفرد زندگی نہیں گزار سکتا، وہ خاندان، کنبے اور قبیلے میں رہتا ہے۔ انسان ایک معاشرہ کے اندر زندگی بسر کرتا ہے جب تک انسانی معاشرہ جدا جدا قبیلوں تک محدود رہا اُس وقت تک خونی رشتے اور قبائلی وابستگی کو اہمیت حاصل رہی۔ جب انسانی معاشرہ نے وسعت اختیار کرلی اور معاشرہ ایک سے زائد قبیلوں پر مشتمل ہونے لگا تو وابستگی کے لیے نئی بنیاد تلاش کرنا پڑی جو مختلف قبائل کو باہم جوڑ سکے اور باہم مربوط رکھ سکے۔

انسانی زندگی کے آغاز میں ہی اللہ تعالیٰ کے فرستادہ نبیوں نے آکر انسانوں کو ایمان باللہ کی تعلیم دی تھی اور بتایا تھا کہ یہی وہ کلمہ جامعہ ہے جو تمام انسانوں کو ایک رشتہ میں منسلک رکھ سکتا ہے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد ہی انسانی فکر میں گمراہی آگئی۔ انہوں نے اللہ کے بجائے بُتوں کی پرستش شروع کردی۔ بُت پرستی کی ہی ایک شکل بادشاہ پرستی تھی۔ طاقتور حکمرانوں نے اپنی رعایا کو مجبور کیا کہ وہ بُتوں کے طور پر بادشاہوں کی پوجا کریں، پرستش کریں۔ اِس طرح ان کا اقتدار اور زیادہ مستحکم ہوگیا۔

قطع نظر اس بات سے کہ شاہ پرستی بذاتِ خود کس قدر غلط ہے، غیر حقیقی ہے اور قابلِ مذمت ہے، مگر اس سے یہ حقیقت واضح ہوجاتی ہے کہ اس قدیم دَور میں بھی

اجتماعی شیرازہ بندی کے لیے مادی رشتے کے بجائے غیر مادی رشتے، مذہبی رشتے کو استعمال کیا گیا۔ قدیم بادشاہتیں، مذہب کے رشتے پر قائم تھیں۔ مذہب خواہ کیسا بچگانہ ہو، ناپختہ ہو، وہ بہر کیف انسان کو حیوانیت سے بلند اور اشرف مخلوق قرار دیتا ہے۔ وہ انسانوں کی زندگی میں اخلاقی اور روحانی اقدار کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ مشرق و مغرب ہر جگہ مذہب کے غلبے کے معنی یہ تھے کہ دینی اور اخلاقی اقدار کا چلن عام ہو۔ انسان زندگی کنبے اور قبیلے میں گذارے مگر اس کا مطمحِ نظر بلند ہو۔ اس کے تصورِ انسان میں ساری انسانیت داخل ہو۔ مذہبی نقطۂ نظر قبول کر لینے کے بعد انسانوں میں پائے جانے والے غیر ضروری اختلافات — شکل و صورت، زبان و رنگ، نسل و خاندان، رسوم و روایات — کو اہم نہیں سمجھا جاتا۔ اصل اہمیت دینی اور اخلاقی اقدار کی ہوتی ہے۔ اس لیے ان اختلافات کے حامل افراد ایک معاشرہ میں، ایک مملکت کے اندر، ایک حکمرانی کے تحت امن و امان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مذہبی نقطۂ نظر قبول کر لینے کے بعد حکمرانوں کی سوچ میں بھی تبدیلی آجاتی تھی۔ حکمران خود کو زمین پر "خدا کا سایہ" سمجھتے تھے۔ اس لیے ان کے نقطۂ نظر میں رعایا کے لیے رحمت و شفقت ہوتی تھی۔ حتی الوسع وہ عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی کرتے تھے۔ افراد، گروہ اور قبائل کے درمیان طبعی اور فطری اختلافات کی بنا پر باہمی منافرت کے جذبہ کو بھڑکنے نہیں دیا جاتا تھا۔ غیر اہم اختلافات کی بنا پر جنگ و جدال کو ناپسندیدہ قرار دیا جاتا تھا۔

دنیا میں تمام قوموں کا حال یکساں نہیں ہے۔ سامی اور تورانی نسلوں کی تاریخ میں مذہب اور نسل کے نام پر جنگوں کا سلسلہ بہت کم ہے۔ البتہ آریائی قوموں میں نسلی برتری اور نسلی تفاخر کا جذبہ بہت گہرا ہے۔ اس لیے ان کے یہاں طویل طویل جنگوں کا پتہ چلتا ہے۔ شاعری میں طویل طویل جنگ نامے آریائی قوموں نے تصنیف کیے ہیں۔ ایلیڈ اور اوڈیسی یونان کے آریاؤں کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں اور رامائن اور مہابھارت ہندوستان کے آریاؤں کی لکھی ہوئی کتابیں۔ ہندو آریاؤں نے ہندوستان کے قدیم باشندوں دراوڑوں کو محکوم بنایا۔ ان کو اچھوت قرار دیا۔ انسانی بنیادی حقوق سے ان کو محروم قرار دیا۔

گذشتہ پانچ ہزار سال سے وہ بنیادی انسانی حقوق سے محروم چلے آ رہے ہیں۔ کسی نے محکوم قوم سے اتنا سخت انتقام نہیں لیا۔ ہندوؤں نے بدھ مت، مذہبی اقلیت کو جب تک اپنی سرزمین سے دیس نکالا نہیں دے دیا اُس وقت تک وہ چین سے نہیں بیٹھے۔ جدید دور میں مسلمان اقلیت سے ان کا سلوک کھلم کھلا نسل کشی کے مترادف ہے۔ دوسری مذہبی اقلیت سکھ اُن کے رویہ سے نالاں ہے۔ سکھوں کے مذہبی مقامات کا تقدس بھی محفوظ نہیں رہا۔

یورپ کی آریا اقوام نے قرونِ وسطیٰ میں قتل وغارت گری اور کشت و خون کا بازار گرم رکھا۔ مختلف مذہبی فرقوں کے درمیان بڑے پیمانہ پر خونریزی ہوئی۔ فرانس میں سینٹ بارتھولومیو کے مقدس دن پر کیتھولک فرقے کے لوگوں نے ہوجونٹ پروٹسٹنٹ فرقے کے لوگوں کا قتلِ عام کیا۔ ایک دن میں اسی ہزار افراد کو بے دردی سے قتل کر ڈالا۔ سفاکی اور ہلاکت آفرینی کے مناظر سے انسانی ضمیر چیخ اُٹھا۔ ہر طرف سے فرقہ پرستی کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ اِس ذہنی پس منظر میں یورپ کے حکما اور مفکرین نے اس مسئلہ کا حل یہ نکالا۔

— مذہب کو انسانی زندگی کے معاملات سے کلیتہً بے دخل کر دیا جائے۔

— معاشرہ کی شیرازہ بندی مذہب کی بجائے حُبِ قوم اور حُب وطن کے فطری جذبے پر رکھی جائے۔

اس نظریہ کو لادینیت (SECULARISM) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد سے یورپ میں لادینیت کا مسلک عام ہو گیا۔ اور مقبول ہو گیا۔ لادینیت کے مسلک کا غلبہ ہو جانے کے بعد اہلِ یورپ کے سامنے معاشرہ کی شیرازہ بندی کے لیے کوئی اُصول باقی نہیں رہا۔ اجتماعی زندگی میں خلا واقع ہو گیا۔ انہوں نے حُب وطن کے طبعی جذبے کو اور حُب قوم کی جبلت کو خلا پُر کرنے کے لیے استعمال کیا۔ بتدریج اہلِ یورپ کا خدا پر ایمان ختم ہوتا گیا۔ خالی جگہ پر وطنیت کے دیوتا نے قبضہ جما لیا۔

یہی وہ دور ہے جب یورپ کی اقوام دُنیا جہان کی تسخیر پر متوجہ تھیں۔ امریکہ، افریقہ،

اور ایشیا کے وسیع و عریض خطوں پر ان قوموں نے قبضہ جما لیا تھا۔ وہاں کی دولت سے اپنا گھر بھر لیا، اس عالمی لوٹ کھسوٹ سے تقریباً سارا ہی یورپ مستفید ہو رہا تھا۔ ملک کے اندر تمام افراد فیض یاب ہو رہے تھے۔ دولت کی بارش ہو رہی تھی۔ اس لیے اہل یورپ چین کی بنسری بجا رہے تھے۔ اس کی وجہ سے یورپی اقوام میں باہمی جنگ وجدال میں بھی کمی واقع ہوئی۔ اس کی تعبیر یہ کی گئی کہ اجتماعی زندگی سے مذہب کو بے دخل کر دینے سے اور وطنی قومیت قبول کر لینے سے یہ امن چین اور یہ خوش حالی ملی ہے۔ حالانکہ حقیقت صرف اس قدر ہے کہ اس دور میں ان ممالک کی تمام تر توجہ ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی لوٹ کھسوٹ پر مرکوز تھی۔ دوسرے تمام مسائل نظر انداز تھے۔ بہرکیف اس دور میں قوم پرستی اور وطنیت کی تحریک کو خوب فروغ اور استحکام حاصل ہوا۔

وطنیت کی حقیقت

وطنی قومیت کا تصور یورپ سے آیا ہے۔ اس کا مفہوم متعین کرنے کے لیے اہل یورپ کی تحقیقات سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔ یورپ کی زبانوں میں قومیت کے لیے لفظ (NATION) ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں نیشن کا لفظ گروہ کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ جس طرح ہمارے یہاں لفظ "قوم" گروہ کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ مثلاً قدیم تحریرات میں ملتا ہے کہ پریگ کی جامعہ میں چار قوموں کے طلبہ پڑھتے تھے۔ بویریا، بوہیمیا، پول اور سیکسن۔ حالانکہ یہ سب ایک ہی ملک جرمنی کے حصے تھے۔ اٹھارھویں صدی کا انگریزی ادیب سیموئیل جانسن (SAMUAL-JOHNSON-1709-1784) اس لفظ کو گروہ کے معنی میں استعمال کرتا ہے۔ YOU ARE A SUBTLE NATION, YOU PHYSICIANS۔ اس میں اطباء کے گروہ کو وہ نیشن کہتا ہے۔

مارٹن لوتھر (MARTIN LUTHER-1483-1546) غالباً پہلا شخص ہے جس نے لفظ نیشن کو معاشرہ کے صاحبِ اقتدار گروہ کے لیے استعمال کیا۔ اور عوام الناس کے لیے اس نے لفظ FOLK استعمال کیا۔ اس کے بعد سے نیشن کے مفہوم میں اقتدار کا عنصر شامل ہو گیا۔ نیشن کے معنی صاحبِ اقتدار گروہ کے ہو گئے۔ یہ مفہوم ترقی کرتا رہا حتیٰ کہ آج کل نیشن ملک کی مقتدر اعلیٰ آبادی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ ہر ہر ملک کے

باشندے اقتدار اعلیٰ کے حامل قرار پائے۔

قوم کی تعریف بیان کرنا اور اس کا حقیقی مفہوم ادا کرنا ایک مشکل کام ہے۔ مختلف لوگوں نے اس سلسلہ میں جو کوششیں کی ہیں ان کا تذکرہ ذیل میں کیا جاتا ہے۔

پروفیسر کیر (CARR) کہتا ہے "قوم کی تعریف کرنا ممکن نہیں ہے"۔

پروفیسر کارلٹن ہیسی (CARLTON HESSI) کہتا ہے "قوم ایک مبہم لفظ ہے۔ ایک رمز بھر (MYSTERIOUS) لفظ ہے۔

لارڈ برائس (LORD BRYCE - 1838 - 1922) لکھتا ہے "قوم سے مراد اشخاص کا ایسا مجموعہ ہے جن کو چند مخصوص جذبات نے ملا کر باہم مربوط کر دیا ہو" دائرہ معارفِ اخلاق اور مذہب کا بیان ہے "قومیت اوصاف کا ایک ایسا مرکب ہے۔ جو ایک گروہ کے افراد میں مشترک ہو۔ جو ان کو جوڑ کر ایک قوم بنا دے"۔

پروفیسر ایمرسن (EMERSON) کہتا ہے۔ "انسانوں کا وہ گروہ جو خود کو ایک قوم سمجھے بس وہ ایک قوم ہے"۔

ظاہر ہے کہ یہ ایک تعریف ہونے کے بجائے ایک ادعا ہے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صحیح بات اسی تعریف میں پنہاں ہے۔ "قومیت ایک اندرونی شعور ہے، جو مختلف افراد کو ایک رشتہ میں ایک قوم میں مربوط کر دیتا ہے"۔

قومیت اور وطنیت کی بنیاد تلاش کرنے میں بھی اہل علم کے درمیان اختلاف ہے کہ وہ مشترک صفت کیا ہے جس نے افراد کو اور گروہوں کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیا ہے۔

ہرڈر (HERDER - 1744 - 1803) نے رسوم و رواجات اور ثقافت کو قومیت کی بنیاد قرار دیا ہے۔

گوبینو (GOBINEAU - 1816 - 1862) نے نسل کو قومیت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ وہ نارڈک نسل (NORDIC RACE) کو دنیا کی اشرف ترین نسل مانتا ہے۔

نطشے (NEITZSCHE - 1844 - 1900) نے زبان پر زور دیا ہے

زبان کو وہ قومیت کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک جرمن زبان دنیا کی اعلیٰ ترین زبان ہے۔

اس طرح مختلف لوگوں نے مختلف امور کو قومیت کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اگر ان سب کو جمع کیا جائے تو یہ درج ذیل نو امور بنتے ہیں۔

۱۔ مشترکہ نسل۔

۲۔ مشترکہ زبان۔

۳۔ مشترکہ مذہب۔

۴۔ مشترکہ ثقافت و تہذیب۔

۵۔ مشترکہ مزاج و عادات و اطوار۔

۶۔ مشترکہ تاریخ۔

۷۔ مشترکہ شعور محبت و دوستی۔

۸۔ مشترکہ شعور دشمنی و نفرت۔

۹۔ مشترکہ آرزوئے آزادی وطن۔

قومیت اور وطنیت کی تحریک سے وقت کی بادشاہتوں اور شہنشاہتوں کو بڑا خوف لاحق ہوا۔ انہوں نے اس جذبہ کو کچلنے کی کوشش کی۔ اس لیے قوم پرستی کی تحریک کو پروان چڑھنے اور فروغ پانے میں عظیم الشان قربانیاں دینا پڑی ہیں۔ مختلف ملکوں میں مختلف رہنماؤں نے اس کی خاطر سخت جان فشانی اور سخت جدوجہد کی ہے۔ جرمنی میں ہیگل (HEGEL -1770-1831) فشکے (FICHTE -1762-1814) اور ٹریشکے (TRIETSCHKE -1834-1896) نے وطنی قومیت کو مقبولِ عام بنایا۔ فرانس میں گوبینو (GOBINEAU -1816-1862) نے اور دوسرے لوگوں نے وطنی قومیت کو مقبول بنایا۔ اطالیہ میں مازنی (MAZZINI -1805 -1873) اور گیری بالڈی (GARIBALDI -1807- 1872) نے وطنی قومیت کے تصور کو مقبولِ عام بنایا۔ مازنی نے تو اس قدر مبالغہ سے کام لیا کہ قوم کو الوہیت (DIVINITY)

کا مظہر قرار دیا۔ اور برملا قوم کو اس نئے دیوتا کی پرستش کی دعوت دی۔ اسی طرح دوسرے ملکوں میں بھی مختلف رہنماؤں نے جدوجہد کر کے وطنی قومیت کو مقبولِ عام بنایا۔

قوم پرستوں کی ان کوششوں سے یورپ میں ایک ہمہ گیر تحریک قومیت برپا ہو گئی۔ جس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا۔ مجبوراً سیاست دانوں کو بھی اس کا نوٹس لینا پڑا۔ زوالِ نپولین (۱۸۱۵ء) کے بعد یورپ کی تشکیلِ جدید کے لیے جب وائنا (WIENNA) کی کانگریس میں تمام بڑے بڑے سیاست دان جمع ہوئے تو انہوں نے غور و خوض کر کے قوم کی تعریف متعین کی۔ وہ یہ ہے:

"ہر وہ آبادی جو نسل، تہذیب، مذہب، زبان اور تاریخ کے اعتبارات سے ایک ہو، وہ ایک قوم ہے۔ اور ہر قوم کو سیاسی اعتبار سے آزاد اور خود مختار رہنے کا حق حاصل ہے۔"

وائنا کی کانگریس قوم پرستی کی تحریک میں ایک اہم سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے یہاں سے یورپ کی سیاست میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ تاریخ نے ایک نیا ورق الٹ دیا۔ اس کے بعد سے سیاست کاری میں جذبۂ محرکہ اور فعال عامل صرف قوم پرستی کا جذبہ بن گیا۔ اس کے بعد ہر ملک نے کوشش کی کہ وہ خود کو ایک قوم ثابت کر دے۔ زبان، نسل اور وطن سے متعلق انفرادیت کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا گیا اور ان کی خوب خوب ترویج و اشاعت کی گئی۔ قومی عظمت کے بیان کے لیے تاریخ کو استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد تاریخ واقعات کا بے لاگ بیان ہونے کے بجائے قومی عظمت کا ایک مدلل مقدمہ معلوم ہوتی ہے۔ اس دور میں آثار قدیمہ (ARCHAEOLOGY) نے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی۔ اب قومی عظمت کے لیے نسلی تفاخر، لسانی برتری اور تاریخی عظمت جیسے امور کا بیان کرنا ضروری ہو گیا۔

(باقی)